ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

کیرن آرمسٹرانگ اور نظریات صوفیاء میں مشترکات کا تحقیقی جائزہ

A COMPARATIVE STUDY OF COMMONALITIES BETWEEN KAREN ARMSTRONG'S VIEWS AND SUFI DOCTRINES

1. Muhammad Ahmad
MS Islamic Studies, Institute of Humanities and Arts, Khwaja Fareed University of Engineering & Information Technology (KFUEIT), Rahim Yar Khan, Pakistan.
2. Dr. Shahid Habib
Assistant Professor, Institute of Humanities and Arts, Khwaja Fareed University of Engineering & Information Technology (KFUEIT), Rahim Yar Khan, Pakistan.
3. Dr. Syed Hamid Farooq Bukhari
Head, Department of Islamic Studies, University of Gujrat, Pakistan.
Email: hamid.farooq@uog.edu.pk

Abstract

Karen Armstrong, a renowned scholar of religion, emphasizes the experiential and compassionate essence of spirituality, which resonates deeply with Islamic Sufi doctrines. This study explores the commonalities between Armstrong's perspectives and Sufi teachings, focusing on their shared emphasis on divine love, human compassion, and spiritual experience over rigid intellectualism. Armstrong's works, such as A History of God and Twelve Steps to a Compassionate Life, highlight that true religious experience transcends logical arguments, advocating for a heartfelt connection with the divine, akin to Sufi concepts of divine love (ishq) and annihilation of the self (fana). Both Armstrong and Sufis like Rumi, Ibn Arabi, and Rabia Basri underscore the centrality of love and humility in approaching God, viewing compassion as the core of religious practice. Armstrong's belief in the unity of religious traditions aligns with Sufi notions of wahdat al-wujud (unity of existence), where all paths converge toward a singular divine truth. Furthermore, both reject religious extremism, advocating for tolerance and interconnectedness across faiths. Armstrong's emphasis on spiritual transformation through humility mirrors the Sufi journey of self-purification and divine proximity. This comparative analysis reveals a profound convergence in their approaches, emphasizing experiential spirituality, universal compassion, and the transcendence of ego as pathways to divine truth. By exploring these shared themes, the study underscores the potential for interfaith dialogue and mutual understanding rooted in the universal quest for meaning and connection with the divine.

***Key Words**: Divine Love, Compassion, Spiritual Experience, Humility, Unity of Existence*

تعارف موضوع

کیرن آرمسٹرانگ ایک معروف مذہبی دانشور ہیں جن کی تحریروں نے مذہب کی روحانی اور انسانی جہتوں کو اجاگر کیا ہے۔ان کے نظریات اسلامی صوفیاء کی تعلیمات کے ساتھ گہری ہم آہنگی رکھتے ہیں، جو خدا کی محبت، انسانی شفقت، اور روحانی تجربے پر زور دیتے ہیں۔ یہ تحقیقی جائزہ آرمسٹرانگ اور صوفیاء کے نظریات میں موجود مشترکات کا تجزیہ کرتا ہے، جو محبت، عاجزی، اور مذاہب کی ہم آہنگی جیسے موضوعات پر مرکوز ہیں۔ آرمسٹرانگ کی کتابوں جیسے کہ A History of God اور Twelve Steps to a Compassionate Life میں مذہب کی اصل روح کو انسانی ہمدردی اور خدا کے ساتھ ذاتی تعلق سے جوڑا گیا ہے۔اسی طرح، صوفیاء جیسے مولانا رومی، ابن عربی، اور رابعہ بصری خدا کی معرفت کو محبت اور قلب کی پاکیزگی سے حاصل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ دونوں نقطہ ہائے نظر مذہب کو عقلی دلائل سے بالاتر ایک روحانی سفر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ مطالعہ ان مشترکات کو واضح کرتا ہے جو نہ صرف انفرادی روحانی ترقی بلکہ عالمی ہم آہنگی اور بین المذاہب مکالمے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

مذہبی تجربہ اور خدا کا تصور

کیرن آرمسٹرانگ کے نزدیک مذہبی تجربہ ایک غیر معمولی کیفیت ہے جو انسان کو خدا کی حقیقت کے قریب لے آتی ہے۔ان کی کتاب "A History of God" میں وہ واضح کرتی ہیں کہ خدا کا تصور محض ایک نظریاتی مسئلہ نہیں بلکہ انسان کے قلبی اور روحانی تجربے کا حصہ ہے۔ آرمسٹرانگ کہتی ہیں کہ خدا کو محسوس کرنے کے لئے دل کی تربیت ضروری ہے، جو صوفیانہ تعلیمات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ آرمسٹرانگ لکھتی ہیں:

"خدا کا تصور ہمیشہ سے انسان کی روحانی زندگی کا حصہ رہا ہے، اور اسے محض ایک فلسفیانہ یا منطقی مسئلہ کے طور پر دیکھنا اس کے اصل مقام کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ خدا کو سمجھنا عقل سے ماورا ایک سفر ہے، ایک ایسا سفر جس میں انسان کو اپنے دل، اپنے جذبات اور اپنی روح کے راستے خدا تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ اکثر مذاہب میں خدا کو جاننے کے لیے ایک خاص تربیت درکار ہوتی ہے۔ صوفیانہ روایتوں میں یہ تربیت قلب کی پاکیزگی، روحانی مشقوں اور محبت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ خدا کو مکمل طور پر جاننے کے لیے عقلی دلیل کافی نہیں ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو ترک کر کے خدا کی محبت میں ڈوب جائے۔ اس محبت کو پا لینے کا عمل ہی اصل مذہبی تجربہ ہے، جس میں خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق پیدا ہوتا ہے۔[1]"

آر مسٹرانگ کے نزدیک، یہ تصور اسلامی صوفیاء کی تعلیمات میں نمایاں ہے، جہاں خدا کے ساتھ محبت اور عاجزی کے ذریعے قربت حاصل کی جاتی ہے۔

صوفیاء کا بھی یہ ہی خیال ہے کہ خدا کو عقل یا منطق کی مدد سے نہیں بلکہ محبت، عاجزی اور قلب کی پاکیزگی کے ذریعے جانا جا سکتا ہے۔ مثلاً، حضرت رابعہ بصری کا کہنا تھا، "میں خدا سے اس کی محبت کے لیے محبت کرتی ہوں، نہ کہ کسی اور چیز کے لیے۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صوفیاء اور آر مسٹرانگ دونوں خدا کے تعلق میں محبت کو بنیادی عنصر سمجھتے ہیں۔

انسانیت اور شفقت

کیرن آر مسٹرانگ کی تعلیمات میں انسانی ہمدردی، محبت، اور دوسروں کے لیے شفقت کو بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے، جو صوفیانہ تصورات سے بھی گہری ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ صوفیاء کرام کے نزدیک انسان کی روحانی پاکیزگی اور خدا کی قربت کے لیے لازم ہے کہ وہ دل سے نفرت، غصہ، اور تکبر کو نکال کر محبت اور شفقت کو جگہ دے۔ آر مسٹرانگ بھی اپنی کتابوں میں بار بار اس بات پر زور دیتی ہیں کہ ہر مذہب کی اصل روح انسانیت اور ہمدردی کا فروغ ہے۔ ان کی کتاب Twelve Steps to a Compassionate Life میں، وہ کہتی ہیں:

"اصل مذہبی روح انسانوں کے درمیان محبت، برداشت، اور ہمدردی کو فروغ دینا ہے۔ کسی بھی مذہب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی خواہشات اور خودی سے بلند ہو کر دوسروں کے درد کو سمجھیں اور ان کے لیے نرم رویہ اپنائیں۔ شفقت کے بغیر کوئی بھی ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ شفقت ہمیں اپنے روحانی تجربے کو نہ صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے بلکہ اس کو دنیا میں عملی طور پر بروئے کار لانے کا درس دیتی ہے۔ صوفیانہ تعلیمات بھی یہی ہیں کہ حقیقی بندگی اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کو خدا کا عکس سمجھیں اور ان کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت رکھیں۔[2]"

وہ کہتی ہیں کہ مذہب اور انسانیت کے درمیان حقیقی تعلق قائم کرنا شفقت، محبت، اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کے ذریعے ممکن ہے۔ صوفیاء میں یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا، "اگر تم خدا کے دوست بننا چاہتے ہو تو انسانیت کے دوست بنو۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیانہ تعلیمات میں انسانیت سے محبت اور شفقت کو ایک روحانی اصول کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔

مذاہب میں ہم آہنگی

کیرن آر مسٹرانگ کا نظریہ ہے کہ مختلف مذاہب میں بنیادی طور پر ایک ہی سچائی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ہر مذہب میں روحانیت اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کا پیغام مشترک ہے۔ آر مسٹرانگ کے نزدیک، تمام مذہبی روایتیں درحقیقت ایک ہی حقیقت کو مختلف انداز میں بیان کرتی ہیں۔ ان کی کتاب "The Battle for God" میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ:

"تمام بڑے مذاہب کی بنیادیں مشترکہ ہیں۔ یہ سب ہمیں محبت، ہمدردی، اور برداشت کا درس دیتے ہیں اور ہمیں اپنی ذات سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں سوچنے کا پیغام دیتے ہیں۔ مذہب کی اصل روح لوگوں کے درمیان تفریق پیدا کرنا نہیں، بلکہ انہیں ایک ساتھ جوڑنا ہے۔ جب ہم مذہب کو دوسروں کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو ہم اس کی بنیادی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہیں۔ مذاہب کی اصل وہ مشترکہ اخلاقی اقدار ہیں جو ہمیں دوسروں سے محبت اور ہمدردی کرنے کا درس دیتی ہیں۔ اگر ہم ان اقدار کو عملی طور پر اپنائیں تو ہم دنیا کو ایک بہتر جگہ بنا سکتے ہیں۔[3]"

---

[1] کیرن آرم سٹرونگ، خدا کی تاریخ، مترجم: مبشر علی زیدی، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ص:20

[2] Karen Armstrong, Twelve Steps to a Compassionate Life (New York: Alfred A. Knopf, 2011), pp. 29-30.

[3] Karen Armstrong, The Battle for God (New York: Alfred A. Knopf, 2000), pp. 33-34.

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

انسانوں نے مذہب کو اپنی محدود عقل کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے۔ صوفیاء بھی مختلف مذاہب کو مختلف راستے مانتے ہیں جو سب ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں۔ یہ صوفی نقطہ نظر اس بات کی تائید کرتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ان میں ایک طرح کی روحانی ہم آہنگی ہے، جسے سمجھنا انسان کی ذمہ داری ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ اور صوفیاء کے نظریات میں ایک اہم قدر مشترک عاجزی اور خودی کو مٹانے کا اصول ہے۔ آرمسٹرانگ کے نزدیک خودی، غرور اور انا انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں اور روحانی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ انسان کو خدا کے قریب پہنچنے کے لیے عاجزی اور انکساری اختیار کرنی چاہیے، کیونکہ یہی راستہ اسے حقیقت کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح، صوفیاء کرام کے نزدیک بھی خودی کو ختم کرنا اور عاجزی کو اختیار کرنا روحانی ارتقاء کا لازمی حصہ ہے۔ جیسا کہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ فرماتے ہیں، "خودی کو مٹاؤ اور حقیقت کو پاؤ۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیاء کے نزدیک بھی انسان کی اصل شناخت اور اس کی روحانی بلندی کا دارومدار اس کی عاجزی اور خودی کے مٹانے پر ہے۔

آرمسٹرانگ کی کتاب The Spiral Staircase میں انہوں نے اپنے ذاتی روحانی سفر کو بیان کیا ہے، جس میں عاجزی اور خودی کو ختم کرنے کا فلسفہ شامل ہے۔ آرمسٹرانگ کے مطابق، زندگی میں روحانی ترقی کے لمحات انسان کو اپنے وجود کی حقیقت کے قریب لے آتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ روحانی سفر ایک تدریجی اور مسلسل عمل ہے جو انسان کو اپنی اصل حقیقت سے روشناس کراتا ہے، اور یہ سفر عاجزی اور صبر کی راہ سے گزرتا ہے۔ صوفیاء بھی انسان کو اس طویل روحانی سفر پر زور دیتے ہیں، جس میں خود آگاہی اور استقامت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مولانا رومی فرماتے ہیں، "جو کچھ تم باہر تلاش کرتے ہو، وہ تمہارے اندر ہے۔" اس قول سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ حقیقت کو پانے کے لئے انسان کو اپنے اندر جھانکنا اور اپنے اندرونی عیوب کو مٹانا ضروری ہے۔

آرمسٹرانگ مذہبی بنیاد پرستی اور تعصب کی سخت مخالف ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ مذہب کا اصل مقصد انسانوں کو متحد کرنا اور ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔ The Battle for God میں، وہ بنیاد پرستی کو انسانی خوف اور جہالت کا نتیجہ قرار دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ تعصب مذہب کی اصل روح کے خلاف ہے۔ ان کے مطابق، بنیاد پرستی کی نفی اور وسعت نظری میں ہی مذہب کی حقیقی روح موجود ہے۔ صوفیاء کی تعلیمات بھی بنیاد پرستی کے خلاف ہیں اور ان میں رواداری، وسعت نظری اور ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا، "محبت کے بغیر مذہب بے معنی ہے۔" یہ قول ظاہر کرتا ہے کہ مذہب کی اصل روح انسانیت کی خدمت اور محبت کا فروغ ہے۔

آرمسٹرانگ کے نظریے میں خدا کا تصور ایک وحدانی اور ہمہ گیر اصول پر مبنی ہے، جو کہ صوفیاء کے وحدت الوجود کے تصور سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ خدا کی موجودگی کو کائنات کی ہر شے میں محسوس کرتی ہیں اور اس وحدت کو انسانی زندگی کا لازمی جزو قرار دیتی ہیں۔ حضرت ابن عربی کے بقول، "خدا ہر چیز میں ہے اور ہر چیز خدا میں ہے۔" یہ تصور آرمسٹرانگ اور صوفیاء کے نظریات میں خدا اور کائنات کے وحدانی تصور کو اجاگر کرتا ہے۔

مذہب کی بنیادی نوعیت

ابتدائی انسانی مذاہب کا تصور ایک وحدانی خدا کے ارد گرد تھا، جو تخلیق کی تمام علتوں کی بنیاد اور زمین و آسمان کا حاکم تھا، مگر اس کا کوئی معبد یا مخصوص مذہبی رسومات نہیں تھیں۔ جیسے جیسے انسانی معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا گیا، انسانی شعور اور تجربات نے خدا کو مختلف شکلوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ بابلی تہذیب میں، جہاں قدرتی عناصر اور مظاہر کو دیوتاؤں سے منسوب کیا گیا، ان کا مقصد کائنات کے اندر ایک نظم اور استحکام کو برقرار رکھنا تھا۔ اس دور میں ثقافتی کامیابیوں اور نظام کو الٰہی دنیا کا عکس سمجھا جاتا تھا، جس کی بدولت سال نو کے جشن میں دیوتاؤں کی خوشنودی کے حصول کے لیے رسومات انجام دی جاتی تھیں۔

آرمسٹرانگ کے مطابق، مذاہب کے ابتدائی نظریات میں کائناتی ترتیب، ثقافت کی حفاظت اور دیوتاؤں کی رضامندی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس دوران بابلی دیومالا نے بائبل اور قرآن کی تخلیق کی کہانیوں میں اپنے اثرات چھوڑے، جن میں کائنات کے آغاز اور تخلیق کے مختلف پہلو موجود ہیں۔ یہاں پر یہودی اور اسلامی تصوف میں، خدا کے ہمہ گیر تصور کی بازگشت ملتی ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ نے قدیم مذاہب کے اس بنیادی تصور کو بیان کیا ہے جس میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان قریبی تعلق قائم کیا گیا تھا۔ بابلی دیوتا مردوک کی کہانی میں، پہلا انسان دیوتا کے خون اور خاک سے تخلیق کیا گیا تھا، جس سے انسان میں بھی ایک محدود پیمانے پر الوہی فطرت کی جھلک پیدا کی گئی۔ اس قدیم تصور میں انسانوں اور دیوتاؤں میں کوئی بنیادی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا، سوائے اس کے کہ دیوتا لافانی اور زیادہ طاقتور تھے۔ اسی طرح کنعانی مذہب میں بعل اور یم کی کہانی میں زرخیزی اور تباہی کی قوتوں کو دیوتاؤں کی کشمکش کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ قدیم روایات اس تصور کو اجاگر کرتی ہیں کہ تخلیقیت کو الوہی صفت کا درجہ دیا گیا، اور یہ تصور موجودہ دور میں بھی بقا رکھتا ہے، جہاں ہم تخلیق کے لیے الہامی اور معجزاتی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

کیرن آر مسٹرانگ نے اپنی تحقیق میں حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسی شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے جنہیں بائبل میں ایمان اور مذہب کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ان کا تعلق قدیم سیلانی سرداروں سے بتایا گیا ہے جو اپنے قبیلوں کو میسوپوٹیمیا سے کنعان کی سرزمین پر لے گئے۔ان کے بارے میں کوئی ہم عصر ریکارڈ تو دستیاب نہیں، لیکن آر مسٹرانگ کے مطابق، وہ شاید ان خانہ بدوش سرداروں میں شامل ہوں گے جو مغربی سامی زبانیں بولتے تھے، جن میں عبرانی بھی شامل تھی۔ان لوگوں کی زندگی بدوؤں سے مختلف تھی کیونکہ ان میں کرائے کے سپاہی، سرکاری ملازم، تاجر اور دیگر پیشہ ور افراد شامل تھے۔

تجربہ اور حقیقت

کیرن آر مسٹرانگ، ایک معروف مؤرخ اور مذہبی دانشور، نے انسانی تجربات اور مذہبی تعلیمات کے درمیان تعلق کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک، "تجربہ" بنیادی طور پر روحانی اور ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے، جو زندگی کے مختلف مراحل میں افراد کو ان کے مقاصد اور معانی کی تلاش میں رہنمائی کرتا ہے۔آر مسٹرانگ کا کہنا ہے کہ یہ تجربات نہ صرف مذہبی روایات کی توثیق کرتے ہیں بلکہ انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں، اور مختلف ثقافتوں کے درمیان مشترکہ تجربات انسانیت کے تجربے کی عکاسی کرتے ہیں۔ حقیقت کے حوالے سے، آر مسٹرانگ نے یہ واضح کیا ہے کہ مذہبی اور روحانی تجربات کا بنیادی مقصد انسانیت کو ایک مشترکہ حقیقت کی طرف لے جانا ہے، جس میں اخلاقی، سماجی، اور روحانی پہلو شامل ہیں۔ان کا یہ کہنا ہے کہ حقیقت محض مادی نہیں ہوتی بلکہ اس میں روحانی اور معنوی جہتیں بھی ہوتی ہیں، جنہیں سمجھنے کے لیے ہمیں گہرائی میں جانا ہو گا۔ اس کے علاوہ، آر مسٹرانگ یہ بھی بتاتی ہیں کہ مذہبی سچائیاں ہمیشہ تجربات اور تفہیم کی بنیاد پر ترقی پذیر ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے انسانی تجربات کی حقیقت کو سمجھنا انتہائی اہم ہے۔ اس طرح، آر مسٹرانگ کی تعلیمات ہمیں یہ یاد دلاتی ہیں کہ روحانی تجربات انسان کی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، اور تجربہ اور حقیقت کے یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔[4]

کیرن آر مسٹرانگ تصوف میں خدا کی ذات کو تجربہ سے محسوس کرنے کے بارے میں لکھتی ہے کہ :

"یعقوب نے بھی کئی مرتبہ ظہور کا تجربہ کیا۔ایک موقعہ پر اس نے واپس ہران جا کر رشتہ داروں کے دوران اپنی بیوی تلاش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔اپنے سفر کے دوران پہلے پڑاؤ پر وہ وادی اردن) کے قریب Luz کے مقام پر سویا تو خواب میں آسمان سے لے کر زمین تک ایک سیڑھی لگی دیکھی۔ ہمیں فوراً مردوک کا مینار یاد آ جاتا ہے۔کوئی شخص اس کی چوٹی پر دیوتا کے ساتھ ملاقات کر سکتا تھا۔یعقوب نے خواب میں سیڑھی کی بالائی حد پر ایل کو دیکھا جس نے اس پر رحمت نازل کی اور ان وعدوں کی تجدید کی جو اس نے ابرہام کے ساتھ کیسے تھے: یعقوب کی اولادیں ایک طاقتور قوم کی صورت میں کنعان کی مالک بنیں گی۔اس نے ایک اور وعدہ بھی کیا تھا جس پر ہم آگے چل کر بات وعدہ کر کریں گے۔ پاگان مذہب عموماً کسی ایک خطے تک محدود ہوا کرتا تھا: دیوتا کا اختیار کسی مخصوص علاقے تک ؟ تھا، اور سفر کے دوران ہر جگہ کے مقامی دیوتا کی عبادت کرنا ہی دانش مندی تھی۔ لیکن ایل نے یعقوب سے وعدہ کیا کہ جب وہ کنعان سے باہر جائے گا اور اجنبی سرزمینوں میں بھٹکے گا تو وہ اس کی حفاظت کرے گا: ''میں تیرے ساتھ ہوں اور تو جہاں بھی جائے گا میں تیرے ساتھ رہوں گا۔"[5]

یعقوب کا خواب اس بات کی علامت تھا کہ وہ ایک مقدس مقام پر موجود تھا، جہاں آسمانی اور زمینی کے درمیان ایک تعلق قائم تھا۔ یہ تجربہ یعقوب کے لیے ایک نیا آغاز تھا، جہاں ایل نے اس پر رحمت نازل کی اور اس کے ساتھ وعدے کیے کہ اس کی نسلیں طاقتور قوم کی صورت میں کنعان کی مالک بنیں گی۔ یہ وعدہ صرف یعقوب کی ذات تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی نسلوں کے لیے بھی ایک روشن مستقبل کی امید پیدا کرتا تھا۔

مزید برآں، یعقوب کی اس تجربے میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ ایل کے وعدے کے بعد کیسے اپنے ایمان کو نئے سرے سے سمجھتا ہے۔اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کا خدا صرف ایک خاص خطے تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ ہے، خواہ وہ اجنبی سرزمینوں میں ہو یا اپنے وطن میں۔یعقوب نے اس تجربے کے بعد اس مقدس جگہ کی تکریم کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسری طرف کیرن آر مسٹرانگ نے تصور مذہب اور حقیقت کے درمیان تعلق کو واضح کیا گیا ہے، خاص طور پر افلاطون اور ارسطو کے نظریات کے ذریعے۔ افلاطون کی فلسفہ کا مرکز ابدی خیالات اور حقیقت کی تشریح ہے۔ وہ دنیا کو ایک غیر حقیقی سایہ سمجھتا ہے، جہاں حقیقی حقیقت کی عکاسی صرف نظریات میں ہوتی ہے۔اس کی غار کی تمثیل میں، انسان دنیا

---

[4] کیرن آرم سٹرونگ، خدا کی تاریخ، مترجم: مبشر علی زیدی، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ص272

[5] ایضا، ص:24

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

کی سطحی حقیقتوں میں جکڑا ہوا ہے، جبکہ حقیقی علم اور بصیرت آسمانی حقیقتوں میں موجود ہیں۔ افلاطون کے نزدیک روح ایک معبود کی حیثیت سے تصور کی جاتی ہے، جو جسم کی قید میں ہے، اور رسومات کے ذریعے نجات حاصل کر سکتی ہے۔

دوسری جانب، ارسطو نے منطقی استدلال کی بنیاد پر حقیقت کی تفہیم کی کوشش کی۔ اس نے حقیقت کے تجرباتی پہلوؤں پر زور دیا، یہ مانتے ہوئے کہ چیزیں اس وقت تک حقیقت رکھتی ہیں جب تک کہ وہ ٹھوس مادے میں موجود ہوں۔ ارسطو کے نظریہ خدا میں، "غیر متحرک محرک" کا تصور شامل ہے، جو کائنات کا منبع ہے، مگر وہ ایک غیر مذہبی خدا ہے، جو دنیا کی تبدیلیوں سے بے پرواہ ہے۔ اس نے انسانی تجربات اور جذبات کی اہمیت کو تسلیم کیا، مگر اس کا خدا انسان کی زندگی پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

یہ دونوں نظریات ایک مخصوص ماورائی عنصر کی موجودگی پر زور دیتے ہیں، جس کا انسانی زندگی میں ایک اہم کردار ہے۔ اہل فکر نے قدیم اسطوریات کی تعبیر نو کی اور نئی آئیڈیاز کی تشکیل کی، جو کہ انسانی زندگی میں روحانی پہلو کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہیں۔ یہ ماورائیت، انسان کی کاملیت کے لیے ایک بنیادی عنصر سمجھی جاتی ہے، جو زندگی کی روحانی سمت کی تلاش میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح، مذہب کی حقیقت کا تصور انسان کے تجربات اور تفکر کی گہرائی سے جڑا ہوا ہے، جو کہ انسانیت کی روحانی ترقی کا سبب بنتا ہے۔[6]

روحانی متون کی تفہیم

کیرن آرمسٹرانگ کی تحریروں میں روحانی متون کی تفہیم میں گہرائی اور بصیرت کا ایک خاص مقام ہے۔ آرمسٹرانگ کا کہنا ہے کہ روحانی متون صرف مذہبی عقائد کی بیان کردہ معلومات نہیں ہیں، بلکہ یہ انسانی تجربات، جذبات، اور سماجی حقیقتوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ وہ روحانی متون کو اسلوبی اعتبار سے تنقیدی نظر سے دیکھنے کی ضرورت پر زور دیتی ہیں، تاکہ ان کی اصل حقیقت کو سمجھا جا سکے۔ ان کے مطابق، روحانی متون میں موجود علامات، افکار، اور متنی تشریحات کا مطالعہ ایک عمیق تجربہ فراہم کرتا ہے جو انسان کی روحانی زندگی کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

آرمسٹرانگ کی تفہیم کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ روحانی متون انسانی وجود کی بنیادی سوالات کے جوابات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے "ہم کون ہیں؟" اور "ہم یہاں کیوں ہیں؟" یہ متون انسانیت کی معانی کی تلاش میں مدد کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنی روحانی زندگی میں گہرائی پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ روحانی متون کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ہم انہیں اپنی ثقافتی اور تاریخی سیاق و سباق میں دیکھیں، تاکہ ان کی معنویت کو سمجھا جا سکے۔

مثلاً، آرمسٹرانگ یہ بتاتی ہیں کہ یعقوب کے خواب کی کہانی میں، جہاں وہ آسمان سے زمین تک ایک سیڑھی دیکھتا ہے، یہ صرف ایک خواب نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ ہے جو انسانی زندگی کے سفر کی عکاسی کرتا ہے۔ یعقوب کے خواب میں خدا کی موجودگی اور وعدہ کا ذکر، اس کی روحانی تلاش اور حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ ایک یاد دہانی ہے کہ روحانی متون میں موجود کہانیاں اور تجربات، انسانی زندگی کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو آشکار کرتے ہیں۔

آرمسٹرانگ کا یہ نقطہ نظر یہ واضح کرتا ہے کہ روحانی متون میں صرف تشریحات نہیں بلکہ ان کے پیچھے انسانی احساسات، تجربات، اور اجتماعی ذہن کی تلاش ہوتی ہے، جو انسانی روح کی جستجو میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح، آرمسٹرانگ کی تفہیم کے ذریعے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ روحانی متون کا مطالعہ ہمیں زندگی کے زیادہ عمیق سوالات کے جواب دینے اور انسانی روح کے تجربات کی بہتر تفہیم میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ایک روحانی حقیقت کی تلاش

ان کے نظریات میں ایک مرکزی خیال یہ ہے کہ تمام مذاہب ایک ہی روحانی حقیقت کی تلاش کرتے ہیں۔[7]

اس کے بارے میں وہ لکھتی ہے:

"اچانک اسے محسوس ہوا کہ یہواہ خود بھی معبد کے عین اوپر آسمان میں اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہواہ کا نور معبد میں بھرا ہوا تھا اور اس کے ساتھ موجود دو سیرانیوں (seraphs) نے اپنے پروں کی مدد سے چہروں کو ڈھانپ رکھا تھا کہ نہیں ان کی نظر یہواہ کے چہرے پر نہ پڑ جائے۔ وہ پکار رہے تھے: پاک! پاک ایہواہ Sabaoth پاک ہے۔ اس کی شان اور جلال ساری کائنات میں پایا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ معبد کی بنیادیں ہل رہی ہیں اور اس میں دھواں بھر گیا ہے۔ گاڑھے دھوئیں نے میہواہ کو اسی طرح چھپا لیا ہے جیسے موسی سے کوہ سینا پر چھپایا تھا۔ آج جب ہم لفظ مقدس یا پاک استعمال کرتے ہیں تو عموماً ہماری مراد ایک اخلاقی کمال سے ہوتی ہے۔ تاہم، عبرانی لفظ "کدوش (kaddosh) کا اخلاقیات سے کوئی تعلق

---

[6] ایضاً، ص:25

[7] کیرن آرمسٹرونگ، خدا کی تاریخ، مترجم: مبشر علی زیدی، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، صفحہ: 280-305

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

نہیں، بلکہ اس سے مراد ایک بنیادی بے نیازی ہے۔ کوہ سینا پر یہواہ کی شبیہ نے اس وسیع خلیج پر روشنی ڈالی جو انسان اور الوہی دنیا کے بیچ اچانک پیدا ہو گئی تھی۔ یسعیاہ نے الوہیت کے اس مفہوم کا تجربہ کیا تھا جو مردوں اور عورتوں پر وقتاً فوقتاً منکشف ہوئی اور انھیں اور خوف سے بھر دیا۔ اس چھاجانے والے تجربہ میں کوئی منطقی چیز نہیں Axial- عہد کا نیا یہواہ اب بھی رب الافواج (Sabaoth) تھا، لیکن اب وہ صرف جنگ کا خدا نہیں رہ گیا تھا۔ نہ ہی وہ محض ایک قبائلی دیوتا تھا، جو اسرائیل کے حق میں جانبدار ہو: اب اس کی شان و شوکت صرف ارض موعودہ تک محدود نہ رہی، بلکہ سارے کرۂ ارض پر چھا گئی۔"

کیرن آرمسٹرانگ کے اقتباس کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ یسعیاہ کے روحانی تجربات ایک خاص قسم کی الوہیت کی سمجھ کو پیش کرتے ہیں۔ یسعیاہ کا تجربہ اس کے لیے ایک طاقتور بصیرت فراہم کرتا ہے کہ یہواہ کی حقیقت صرف ایک مقامی دیوتا یا جنگ کے خدا سے آگے بڑھ چکی ہے۔ یہ تجربہ یسعیاہ کے لیے الوہیت کی ایک نئی تفہیم کی عکاسی کرتا ہے، جہاں وہ خدا کو اپنے عرش پر دیکھتا ہے، جو معبد کی بنیادوں کو ہلا دیتا ہے اور دھویں سے گھرا ہوا ہے۔

آرمسٹرانگ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ عبرانی لفظ "کدوش" کا مفہوم صرف اخلاقی کمال نہیں بلکہ ایک بنیادی بے نیازی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہواہ کی پاکیزگی اور اس کی اعلیٰ شان کا تجربہ انسانوں کی محدودیتوں سے ایک وسیع تر حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ یسعیاہ کا یہ تجربہ ایک ایسے خدا کے سامنے آنے کی نشانی ہے جو صرف اسرائیل کا نہیں بلکہ تمام کائنات کا رب ہے۔ اس نے انسانی تجربے میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا، جو خدا کی عظمت اور قدرت کو بے نقاب کرتی ہے۔

یہ تجربہ یسعیاہ کی زندگی میں ایک تبدیلی کا باعث بنتا ہے، جہاں وہ اپنے وجود کی حقیقت کو ایک نئے سرے سے سمجھتا ہے۔ اس کی ایک نئی روحانی بصیرت، خدا کی شان اور جلال کا ادراک، اور انسانی وجود کی ناپختگی کی پہچان کا ذریعہ بنتی ہے۔ یسعیاہ کا یہ تجربہ، جو ایک خوفناک اور حیرت انگیز لمحہ تھا، دراصل انسانی روح کی اپنی محدودیتوں کے مقابلے میں ایک اعلیٰ حقیقت کے سامنے جھکنے کی نشانی ہے۔ یہ روحانی تجربہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم اپنے وجود کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے صرف منطقی دلائل پر ہی انحصار نہیں کر سکتے، بلکہ ہمیں اپنے اندرونی تجربات اور روحانی بصیرتوں کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔

صوفیوں کا خدا

یہودیت، عیسائیت اور کچھ کم حد تک اسلام نے بھی ایک شخصی خدا کا تصور پیش کیا، اس لیے ہم سوچ سکتے ہیں کہ یہ تصور مذہب کی بہترین انداز میں نمائندگی کرتا ہے۔ شخصی خدا نے وحدانیت پرستوں کو اس قابل بنایا کہ وہ فرد کے مقدس اور ناقابل منسوخ حقوق کی قدر کر سکیں اور انسانی ذات کو رفیع الشان بنائیں۔ یہودی۔ عیسائی روایت نے اس طریقہ سے مغرب کو اپنی اقدار میں آزاد انسانیت پرستی حاصل کرنے میں مدد دی۔ اصل میں یہ اقدار شخصی خدا کی دین تھیں جو تمام نسانی وظائف سرانجام دیتا تھا: وہ بالکل ہماری طرح محبت کرتا، فیصلے سناتا، سزائیں دیتا، دیکھتا، سنتا، بناتا اور تباہ کرتا ہے۔ ابتدا میں یہواہ پر زور انسانی پسند و ناپسند والا نہایت شخصی خدا تھا۔ بعد میں وہ ماورائیت کی ایک علامت بن گیا جس کی سوچیں ہمارے جیسی نہ تھیں اور جس کے راستے ہم سے بہت اوپر آسمانوں میں منتقل ہو گئے۔ شخصی خدا مذہب کی ایک اہم تفہیم عطا کرتا ہے۔ شخصی نظریہ مذہبی اور اخلاقی ترقی کی راہ میں ایک اہم اور ناگزیر مرحلہ رہا ہے۔ اسرائیل کے پیغمبروں نے اپنے تمام جذبات واحساسات خدا سے منسوب کر دیے بودھوں اور ہندوؤں کو حقیقت مطلق کو اوتاروں کی صورت میں ایک شخصی روپ دینا پڑا۔ عیسائیت نے ایک انسان کی ذات کو ایسا روپ دے دیا جس کی مثال مذہب کی تمام تاریخ میں نہیں ملتی: اس نے یہودیت کے نظریہ شخصیت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ شاید اگر اس قسم کی تشبیہات موجود نہ ہوتی تو مذہب اپنی جڑیں ہی گہری نہ کر پاتا۔ تاہم شخصی خدا ایک بھاری بوجھ بن سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے تخیل میں تراشے ہوئے. محض ایک تصور کی صورت اختیار کر لئے ہماری اپنی محدود ضرورتوں، خوفوں اور خواہشات کی ہی بڑھا چڑھا کر پیش کی ہوئی صورت۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وہ بھی انھی چیزوں سے محبت یا نفرت کرتا ہے جو ہمارے لیے قابل محبت یا نفرت ہیں۔ یوں ہمیں اپنے تعصبات کی توثیق حاصل ہو جاتی ہے۔ جب خدا کسی تباہی کو روکنے میں ناکام ہو جاتا یا کسی ٹریجڈی کا خواہش مند نظر آتا ہے تو بہت ظالمانہ روپ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ تباہی و بربادی کو خدا کی منشا سمجھنے کا عقیدہ ہمیں اپنے گھناؤنے حالات چپ چاپ قبول کر لینے پر مائل کرتا ہے۔ خدا کو مرد یا عورت بنانا بھی اسے محدود کرتا ہے: یوں سمجھ لیں کہ ایسی صورت میں آدھی انسانیت نظر انداز ہو سکتی ہے۔ چنانچہ شخصی خدا کا نظریہ خطرات سے پر ہے۔ شخصی خدا ہمیں اپنی انا کی حدود میں سے نکلنے پر مجبور کرنے کے بجائے ہمیں اور بھی زیادہ بند رہنے پر مائل کر سکتا ہے۔ وہ خود کو دیے گئے روپ کے مطابق ہی ہمیں بھی ظالم، جابر، جانبدار اور خود غرض بنا سکتا ہے۔ لہذا الگتا ہے کہ شخصی خدا کا تصور ہماری مذہبی ترقی کی راہ میں محض ایک مرحلہ ہے۔ غالباً تمام مذاہب عالم نے یہ خطرہ محسوس کر لیا اور حقیقت مطلق کے شخصی تصور سے بالاتر ہونے کی کوشش کی۔ ہم یہودیت کے مقدس صحائف کو پاکیزگی اور بعد میں قبائلی Wاور شخص یہواہ کو تیاگنے کی کہانی کے طور پر پڑھ سکتے ہیں۔ عیسائیت نے ماورائے شخصی عقیدہ متعارف کروا کر مجسم خدا کا مسلک منوانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کو بھی بہت جلد خدا کی سمیع و بصیر جیسی صفات کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تینوں وحدانیت پرست مذاہب میں باطنی روایت پیدا ہوئی جز نے ان کے خدا کو شخص کیلگری نکال کر کافی حد تک نروان اور پرہما۔ آتما جیسی غیر شخصی حقیقوں سے مشابہہ بنا دیا۔ چند ایک لوگ ہی حقیقی تصوف کے اہل ہیں، لیکن تینوں بڑے مذاہب میں صوفیوں کے خدا کو ہی سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، تو آج تک قائم ہے۔ تاریخی وحدانیت پرستی اصلاً صوفیانہ نہیں تھی۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

تینوں پیغمبرانہ مذاہب کا مطمع نظر خدااور Wانسانیت کے درمیان شخصی ملاقات ہے۔ یہ خدا عمل کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے؛ وہ ہمیں اپنی طرف بلاتا ہے؟ وہ ہمیں اپنی محبت قبول یا مسترد کرنے کی چوائس دیتا ہے۔[8]

یہ خداانسانوں کے ساتھ مکالمہ کرتااور ہم کلام ہوتا ہے۔ عیسائیت میں خدا کے ساتھ تعلق محبت سے عبارت ہے۔ لیکن محبت یا بھگتی کے لیے اپنی انا کو کچلنالازمی ہے۔ محبت میں انا پسندی کاامکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

صوفیانہ سفر نے مہارت اور مخصوص تربیت کو ضروری قرار دیا۔ ابتدائی یہودی وجدانوں میں سب سے زیادہ متنازعہ اور نرالاوجدان پانچویں صدی عیسوی کی ایک تحریر بلندی کی پیمائش میں ملتا ہے جس میں ایک چہرہ مہرہ بیان کیا گیا ہے جسے حزقی ایل نے ندا کے تخت پر دیکھا تھا۔ بلندی کی پیمائش میں اس ہستی کو ہمارا خالق کہا گیا۔ خدا کے اس مخصوص نظارے کی بنیاد غالباً غزل الغزلات کے اس ٹکڑے پر ہے۔

دلہن اپنے محبوب کو یوں بیان کرتی ہے:

میرا محبوب سرخ وسفید ہے۔
وہ دس ہزار میں ممتاز ہے۔
اس کا سر خالص سوتا ہے۔
اس کی زلفیں پیچ در پیچ اور کوے کی کالی ہیں۔
اس کی آنکھیں ان کبوتروں کی مانند ہیں
جو دودھ میں نہا کر لب دریا تمکنت سے بیٹھے ہوں۔
اس کے رخسار پھولوں کے چمن اور بلسان کی ابھری ہوئی کیاریاں ہیں۔
اس کے ہونٹ سوسن ہیں جن سے رقیق کر ٹپکتا ہے۔
اس کے ہاتھ زبرجد سے مرصع سونے کے حلقے ہیں۔
اس کا پیٹ ہاتھی دانت کا کام ہے جس پر نیلم کے پھول بنے ہوں۔ اس کی ٹانگیں کندن کے پایوں پر سنگ مرمر کے ستون ہیں۔[9]

گوں نے اسے خدا کے بیان کے طور پر ویکھا۔ بلندی کی پیمائش میں خدا کی ٹانگوں کی پیمائش کیا ہے۔ اس عجیب وغریب کتاب میں خدا کی پیمائشیں گڑ بڑا کر رکھ دینے والی ہیں۔

کیرن آرم سٹرانگ کے نظریات کے ساتھ کئی دیگر صوفیاء کے خیالات میں بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہاں کچھ اہم صوفیاء اور ان کے نظریات کی مثالیں دی گئی ہیں جو آرم سٹرانگ کے خیالات سے ہم آہنگ ہیں:

ابن عربی

سہروردی سے بھی گہرا اثر محی الدین ابن عربی(1165تا1240ء) نے مرتب کیا۔ ہم اس کی زندگی کو مشرق اور مغرب کے درمیان خط امتیاز کی علامت کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا باپ ابن رشد کا دوست تھا۔ ایک شدید علالت کے دوران ابن عربی صوفی ہو گیااور 30 برس کی عمر میں یورپ چھوڑ کر مشرق میں چلا آیا۔ اس نے حج کیااور دو برس خانہ کعبہ میں عبادت وریاضت کرتے ہوئے گزارے، اور آخر کار دریائے فرات کے کنارے ملاتیہ کے مقام پر سکونت پذیر ہو گیا۔ اکثر اسے شیخ الاکبر کہا جاتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے نظریۂ خدا کو بہت گہرائی میں متاثر کیا لیکن اس کی فکر مغرب کو متاثر نہ کر سکی جس کا خیال تھا کہ اسلامی فلسفہ ابن رشد کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ مغربی عیسائیت نے ابن رشد کے ارسطوئی خدا کو قبول کر لیا، جبکہ زیادہ تر اسلامی دنیا نے ماضی قریب تک خدا کا صوفیانہ تصور اپنائے رکھا۔ 1201ء میں خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے دوران ابن عربی کو ایک مکاشفہ ہوا جس کا اثر بہت پائیدار تھا۔ اس نے نظام نامی ایک جوان لڑکی دیکھی تھی جس کے گرد ہالہ نور تھا۔ ابن عربی نے محسوس کیا کہ وہ الوہی دانش سوفیا (Sophia) کی تجسیم تھی۔ اس کشف نے اسے یہ احساس دلایا کہ اگر ہم صرف فلسفے کے منطقی دلائل پر انحصار کریں تو ہمارے لیے خدا سے محبت کرنا ممکن نہیں۔ فلسفہ اللہ کی قطعی ماورائیت پر زور دیتا اور ہمیں یاد دلاتا تھا کہ کوئی بھی چیز اس جیسی نہیں۔ ہم ایک اس قسم کی بیگانی شخصیت سے کیسے محبت کر سکتے ہیں! کلمہ شہادت ہمیں یاد دہانی کراتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے نتیجہ

---

[8] 71 Reality and Illusion," R.M. Strong (1975p

[9] غزل الغزلات.......۵،۱۰تا۱۵

میں اللہ سے الگ کوئی خوبصورتی بھی موجود نہیں تھی۔ ہم خدا کو صرف نظام جیسی ہستیوں کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ در حقیقت اپنے لیے تمثیلات بنانا صوفی کا فرض تھا تا کہ وہ نظام جیسی لڑکیوں کو دیکھ سکے۔ محبت بنیادی طور پر ایک ایسی چیز کی خواہش کا نام ہے جو غیر حاضر ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ہماری زیادہ تر انسانی محبت نامراد رہتی ہے۔[10]

ابن عربی کے اقوال

تخیل نے نظام کو خدا کے ادتار یہ تبدیل کر دیا تھا۔ کوئی اسی برس بعد نوجوان دانتے کو بھی فلورنس میں اسی قسم کا تجربہ ہوا جب اس نے پرائس پورٹیمٹاری کو دیکھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اسے اپنی روح کانپتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد دانتے پر پیٹر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا۔ وہ دانتے کے لیے الوہی محبت کی تمثیل بن گئی اور The Divine Comedy میں وہ بتاتا ہے کہ وہ کیسے اسے دوزخ اور جنت میں سے گزار کر خدا کے نظارے تک لے گئی۔ دانتے کی شاعری پر مسلمانوں کے تذکرۂ معراج النبی نے کافی گہرے اثرات مرتب کیے تخلیقی تخیل کے بارے میں اس کا نظریہ یقینا ابن عربی جیسا تھا۔

ابن عربی کو یہ بھی یقین تھا کہ تخیل خداداد اہلیت ہے۔ جب کسی صوفی نے اپنے لیے ایک میںبہ تخلیق کی تو اس نے ایک ایسی حقیقت کو جنم دیا تھا جس کی کامل ترین صورت اوپر آسمانی اقلیم میں تھی۔ جب ہم معبود کو دوسرے لوگوں میں دیکھتے ہیں تو اصل حقیقت کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں: وہ یقین رکھتا تھا کہ عورتیں سوفیا یعنی الوہی دانش کی زبردست تجسیم تھیں، کیونکہ وہ مردوں میں محبت کا جذبہ بیدار کرتی ہیں، اور یہ جذبہ انجام کار انھیں خدا کی جانب لگا دیتا ہے۔ بے شک یہ ایک انتہائی مردانہ نقطہ نظر ہے، لیکن یہ خدا (جسے عموماً مرد تصور کیا جاتا تھا) کے مذہب کو ایک مونث صفت عطا کرنے کی کوشش تھی۔

ابن عربی اس بات پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ اسے معلوم خدا کی کوئی معروضی ہستی بھی تھی۔ ایک ماہر مابعد الطبیعیات ہونے کے باوجود وہ خدا کے وجود کو منطق کے ذریعہ ثابت کرنا ممکن نہیں سمجھتا تھا۔ وہ خود کو حضرت خضر کا شاگرد کہا کرتا تھا۔ مسلم روایت میں حضرت خضر ان سب کے گرو ہیں جو باطنی سچائی کی تلاش میں ہیں، اور یہ سچائی باہری چیزوں سے قطعی مختلف ہے۔ حضرت خضر اپنے شاگردوں کو ایک ایسے خدا کے ادراک کی راہ پر نہیں چلاتے جو سبھی کے لیے ایک جیسا ہے، بلکہ وہ انھیں ایسے خدا کی جانب راہنمائی کرتے ہیں جو نہایت موضوعی ہے۔ حضرت خضر اسماعیلیوں کے لیے بھی اہم تھے۔ اگرچہ ابن عربی سنی تھا لیکن اس کی تعلیمات اسماعیلیوں سے کافی مشابہہ نظر آتی ہیں، اور بعد میں انھوں نے اسے اپنی دینیات میں شامل بھی کر ا باطنی مذہب کی ایک اور صورت فرقہ وارانہ تقسیموں سے تجاوز کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسماعیلیوں کی طرح ابن عربی نے بھی خدا کے رحم پر زور دیا و فلسفیوں کے خدا کی بے رحمی کے عین الٹ تھا۔ صوفیا کا خدا اپنی مخلوق کے توسط سے جانا جاتا تھا۔ ابن عربی نے تنہا خدا کو آرزومندی کے عالم میں آہیں بھرتے ہوئے تصور کیا لیکن یہ آہ یا نفس رحمانی خود ترسی کا اظہار نہیں تھا۔ یہ ایک فعال اور تخلیقی قوت کی حامل تھی جس نے ساری کائنات کو ہست کیا۔ چنانچہ ہر انسان خدا کا مظہر ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ہم سب میں خدا کا اظہار الگ الگ طرح کا ہے۔ ہم صرف اپنے خدا کو ہی جاننے کے قابل ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کا تجربہ معروضی طور پر کرنا ممکن نہیں۔ خدا کو اس انداز میں سمجھانا ممکن ہے جیسے وہ دوسروں کو سمجھ آتا ہو۔ ابن عربی یہ حدیث بڑے شوق کے ساتھ اپنی تحریروں میں بطور حوالہ استعمال کرتا ہے: ''خدا کی رحمتوں پر غور و فکر کرو لیکن الذات پر نہیں ۔خدا کی تمام حقیقت نا قابل ادراک ہے، ہمیں چاہیے کہ اپنی ہستی میں بولے گئے لفظ پر توجہ مرکوز کریں۔

لہذا الوہیت اور انسانیت الوہی حیات کے ہی دو پہلو تھے جو ساری کائنات کے ہست ہونے کی بنیاد ہے۔ یہ بصیرت یونانیوں کی اس تفہیم سے مختلف نہ تھی کہ خدا عیسی کی صورت میں جسم ہوا، لیکن ابن عربی یہ تصور قبول نہیں کر سکتا تھا کہ واحد انسان ہی خدا کی لامحدود حقیقت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی بجائے اس کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان خدا کا اوتار ہے۔ تاہم اس نے انسان ہ اس کا ایک نظریہ ضرور بنایا جو اپنے معاصرین کی فلاح کی خاطر ہر نسل میں منکشف خدا کی باطنیت کی تجسیم تھا، تاہم وہ خدا کی حقیقت یا مخفی جوہر کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ابن عربی کے خیال میں رسول اللہ اپنی نسل کے لوگوں میں سے کامل ترین آدمی اور خدا کی ایک موثر ترین علامت تھے۔ دروں میں اور تخیلاتی تصوف ذات کی گہرائیوں میں ہستی کی بنیادوں کی ایک تلاش تھی۔ اس نے صوفی کو اس قطعیت سے محروم کر دیا جو مذہب کی زیادہ کڑہ سورتوں کا خاصہ تھی۔ چونکہ ہر انسان خدا کا تجربہ اپنے اپنے لحاظ سے کرتا تھا اس لیے کوئی ایک اکیلا نہ ہے ہی الوہی سرے تے کو مکمل طور پر منکشف نہیں کر سکتا تھا۔ خدا کے حوالے سے کوئی معروضی سچائی موجود نہیں تھی اس لیے اس کے رجحانات اور طرز عمل کے بارے میں پیشگوئیاں کرنا ممکن نہیں تھا۔ کا نتیجے نظریۂ خدا کی بنیاد پر تنگ نظری اور تعصب نا قابل قبول بنا دیا گیا، کیونکہ کوئی بھی نہ جب خدا کے کلی علم کا حامل نہ تھا۔ ابن عربی نے دیگر مذاہب کی جانب مثبت رویہ اختیار کیا (جسر - پتہ ہمیں قرآن پاک میں بھی ملتا ہے) اور اسے ایک نئی انتہا پر پہنچا دیا۔ خدا کا انسان کنشت، معبد، مندر، کلیسا اور مسجد میں بھی یکساں تھا کیونکہ یہ بھی خدا کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔[11]

---

[10] مفتی محمد صدیق ھزاروی، رسالہ قشیریہ "ناشر مکتبہ اعلی دربار مارکیٹ لاہور 2009ء، ص183

[11] -ایضا، ص184

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

یہ بات درست ہے کہ ابن عربی کی تعلیمات بہت بڑی مسلم اکثریت کے لیے دقیق تھیں لیکن وہ زیادہ عام فرد تک آہستہ آہستہ رستے رستے پہنچ ہی گئیں۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں کے دوران تصوف ایک اقلیتی تحریک نہ رہا اور مسلم سلطنت کے بہت سے علاقوں میں غالب رجحان بن گیا۔ یہ وہ دور تھا جب مختلف صوفیانہ سلسلے (طریقۃ) بنے اور ہر ایک نے صوفیانہ عقیدے کی اپنی اپنی تعریف کی۔ صوفی شیخ عوام پر بڑا اثر ورسوخ رکھتا تھا، اور اس کا تقریباً اسی طرح احترام کیا جاتا تھا جیسے شیعہ اپنے اماموں کا کرتے تھے۔ یہ سیاسی افراتفری کا دور تھا: خلافت بغداد منتشر ہو گئی تھی اور منگول حملہ آور باری باری ہر مسلم شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے۔ لوگ ایک ایسے خدا کے خواہش مند تھے جو فیلسوف کے دور دراز بیٹھے ہوئے خدا اور علما کے شرعی خدا کی نسبت زیادہ قریب اور رحم کرنے والا ہو۔ ذکر کی صوفیانہ روایت طریقہ سے باہر بھی چلی گئی۔ صوفیوں کی بیٹھنے اور سانس لینے کی مشقوں نے لوگوں کو ماورائی ہستی کو اپنے اندر محسوس کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ہر کوئی اعلیٰ تر صوفیانہ حالتوں کے لائق نہ تھا، لیکن ان روحانی مشقوں نے لوگوں کو خدا کے سیدھے سادے اور تشبیہاتی نظریات مسترد کرنے اور اسے اپنی ذات کے اندر تجربہ کرنے کے قابل بنایا۔ کچھ صوفیانہ سلسلوں نے ریاضت اور مجاہدہ کے لیے موسیقی اور رقص کا استعمال کیا اور پیر لوگوں کے ہیرو بن گئے۔

صوفی سلسلوں میں سے مشہور ترین سلسلہ مولویہ تھا، جس کے ارکان کو اہل مغرب "گھومنے والے درویش کہتے ہیں۔ ان کا خوبصورت رقص ریاضت کا ایک انداز تھا۔ تیزی سے گھومتا ہوا صوفی اپنی انا کی حدود کو معدوم ہوتے محسوس کرتا تھا، اور یوں اسے فنا کا ذائقہ ملتا۔ سلسلے کے بانی حضرت جلال الدین رومی (المشہور مولانا روم-1207 تا 1273ء) خراسان میں پیدا ہوئے لیکن جدید ترکی کے شہر قونیہ میں ہجرت کر گئے۔ اس وقت تک منگول وہاں نہیں آئے نے تھے۔ ان کے تصوف کو اس آفت کے ایک رد عمل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جو بہت سوں کو اللہ پر سے ایمان اٹھانے کا باعث بن سکتی تھی۔[12] رومی کے خیالات اپنے ہم عمر ابن عربی سے کافی ملتے جلتے تھے، لیکن ان کی مثنوی عوام میں زیادہ مقبول ہوئی اور اس نے غیر صوفی مسلمانوں میں صوفیوں کے خدا کی تبلیغ کی۔ 1244ء میں رومی ایک سیاحتی درویش شمس تبریز کے زبردست اثر میں آئے اور اسے اپنی نسل کا کامل ترین شخص خیال کیا۔ شمس تبریز کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ وہ خود کو شریعت پر عمل کرنے کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ جب شمس ایک بلوے میں مارا گیا تو رومی کا دل رنج وغم سے لبریز ہو گیا اور وہ رقص وموسیقی میں اور بھی زیادہ ڈوب گئے۔ انھوں نے اپنے غم کو خدا سے محبت کی علامت میں تبدیل کر دیا۔ ہر کوئی جانے یا انجانے طور پر غیر موجود خدا کی تلاش میں تھا، اور ہر کوئی مبہم طور پر یہ احساس رکھتا تھا کہ اس کا اصل منبع اس سے جدا ہے۔ یقین کیا جاتا تھا کہ انسان کامل عام فانی لوگوں کو خدا کی تلاش میں رہنمائی دیتا ہے۔ شمس تبریز نے رومی میں شاعری کے دریا کے سامنے بندھے ہوئے بند کو توڑ ڈالا تھا۔

بہت سے دیگر صوفیا کی طرح رومی نے بھی کائنات کو خدا کے ہزاروں ناموں کی تجلی کے طور پر دیکھا۔ کچھ نام خدا کی غضبناکی کو آشکار کرتے تھے اور کچھ دیگر اس کے رحیم وکریم ہونے کے غماز تھے۔ صوفی تمام چیزوں میں خدا کی محبت، کرم اور خوبصورتی کو تمیز کرنے کی مسلسل جدوجہد میں مصروف تھا۔ مثنوی نے مسلمانوں کو انسانی زندگی میں ماورائی جہت تلاش کرنے اور چیزوں کے ظاہری روپ کے اندر مخفی حقیقت کا سراغ لگانے کا چیلنج دیا۔ انا وہ چیز ہے جو ہمیں اس داخلی حقیقت، کی شناخت نہیں کرنے دیتی لیکن ایک مرتبہ اس کی حدود کو توڑ لینے پر ہم خدا کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں۔ رومی نے ایک مرتبہ پھر زور دیا کہ خدا محض ایک موضوعی تجربہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس دور میں ٹریجڈی نے یہودیوں کو بھی خدا کے ایک نئے تصور کی تشکیل میں مدد دی۔ مغرب کی سامی مخالف لڑائی یہودی لوگوں کے لیے زندگی کو ناقابل برداشت بنا رہی تھی اور بہت سے یہودی اک زیادہ قریبی اور ذاتی خدا کے خواہش مند تھے۔

اسلامی سلطنت کے بیش تر حصوں میں صوفیوں کے خدا نے فلسفیوں کے خدا پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ سولہویں صدی کے دوران یہودیوں کے ہاں بھی ایک ایسا ہی رجحان پیدا ہوا۔ تصوف روایتی مذاہب کی نسبت انسانی ذہن کو زیادہ گہرائی میں متاثر کرنے کے قابل تھا۔ اس کا خدا از یادہ قدیم امنگوں، خدشات اور الجھنوں کی ترجمانی کر سکتا تھا، جو فلسفیوں کا دور رہنے والا خدا نہیں کر سکا تھا۔ چودھویں صدی میں مغرب نے ایک اپنا صوفیانہ مذہب جاری کیا اور اسے ایک زبردست آغاز بھی دیا۔ لیکن مغرب میں تصوف کو دیگر روایات جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔[13]

انگلینڈ، جرمنی اور زیریں خطوں میں (جہاں ممتاز صوفیا پیدا ہوئے)، سولہویں صدی کے پروٹسٹنٹ مصلحین نے اس روحانیت کو غیر بائبلی قرار دیا۔ رومن کیتھولک کلیسیا میں سینٹ تھریسا جیسے ممتاز صوفیا کو بھی اصلاح مخالف افراد کی احتسابی عدالتوں کی جانب سے دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یورپ نے خدا کو اور بھی زیادہ منطقی انداز میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

---

[12] ۔مفتی محمد صدیق ہزاروی، رسالہ قشیریہ "ناشر مکتبہ اعلیٰ دربار مارکیٹ لاہور 2009ء، ص 185

[13] ۔آرمسٹرانگ، کیرن۔ خدا کی تاریخ: یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا 4000 سالہ سفر، بیلنٹائن بکس، 1993، جلد 1، ص 300۔

حضرت ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبی

آپ اپنے زمانے میں علم، تقویٰ، معاملہ اور حال میں بے مثال تھے۔ اصلاً بھری تھے اور آپ کا انتقال 243ھ میں بغداد میں ہوا۔

آپ کا تقوی کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنے والد سے (70,000) ستر ہزار درہم بطور وراثت ملے لیکن آپ نے ان میں سے کچھ مالی حلال مال کھانے والوں کے پاس زیادہ مال نہیں ہوتا اس لیے وہ فضول خرچی نہیں کرتے۔ ۱۲ ہزار وی حال تصوف کی ایک اصطلاح ہے جس کا ذکر اسی کتاب میں تفصیل موجود ہے وہاں دیکھئے۔ ۱۲ ہزار وی بھی نہ لیا۔ کہا گیا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے والد تقدیر کے منکر تھے پس آپ نے تقویٰ اس بات میں سمجھا کہ ان کی میراث سے کچھ نہ لیں اور فرمایا: صحیح روایت میں رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ:
لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَيْئًا۔ [14]

دو مختلف دینوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔

حضرت محمد بن مسروق اللہ فرماتے ہیں: حضرت حارث بن اسد محاسبی بی کا انتقال ہوا تو آپ ایک درہم کے محتاج تھے، حالانکہ آپ کے باپ نے سامان اور زمین چھوڑی لیکن آپ نے اس میں سے کچھ نہیں لیا۔

حضرت حارث محاسبی ہے جب ایسے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے جس میں شبہ ہوتا تو آپ کی انگلیوں پر پسینہ حرکت کرتا اور آپ اس سے رک جاتے۔

حضرت ابو عبداللہ بن خفیف ہے فرماتے ہیں: ہمارے مشائخ میں سے پانچ کی اقتداء کرو اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ (وہ پانچ یہ ہیں) حضرت حارث بن اسد محاسبی بی، حضرت جنید بن محمد (بغدادی)، حضرت ابو محمد رویم حضرت ابوالعباس بن عطاء، حضرت عمرو بن عثمان مکی ہے۔ اس لیے کہ یہ حضرات علم اور حقائق کے جامع تھے۔

حضرت ابو عثمان بلدی یہ فرماتے تھے حضرت حارث محاسبی رحمۃاللہ نے فرمایا:

جو شخص مراقبہ اور اخلاص کے ساتھ اپنے باطن کو درست کرے اللہ اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباع سنت کے ذریعے درست کر دیتا ہے۔

مال حرام کا کھانا نگل نہ پاتے ملے

حضرت جنید بغدادی سے منقول ہے کہ ایک دن حضرت حارث محاسبی پہلے میرے پاس سے گزرے تو میں نے ان میں بھوک کا اثر دیکھا۔ میں نے کہا اے چچا! اندر گھر میں آئیں اور کچھ کھالیں۔

فرمایا: ہاں!

میں گھر میں داخل ہوا اور کچھ تلاش کیا تا کہ ان کی خدمت میں پیش کروں تو گھر میں کھانا رکھا تھا جو کسی شادی والے لوگوں نے بھیجا تھا۔ میں نے ان کے آگے رکھ دیا۔

انھوں نے لقمہ لیا اور کئی بار منہ میں گھمایا پھر وہ کھڑے ہو گئے اور دہلیز پر ڈال کر چلے گئے۔ [15]

آپ کے اقوال

حضرت جنید بغدادی کے صوفیانہ نظریات

سلوک کا تصور : حضرت جنید بغدادی تصوف میں "سلوک" (روحانی سفر) کے نظریے کے اہم حامی تھے۔ ان کے مطابق، ایک صوفی کو نفس کی تطہیر اور اخلاقی پاکیزگی کے ذریعے خدا تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سفر مستقل عبادات، مجاہدے، اور خود کو فنا کرنے (فنا فی اللہ) کے ذریعے ہوتا ہے۔

فنا و بقا : جنید بغدادی کا ایک بنیادی تصور "فنا" تھا، یعنی خدا کی محبت اور قربت میں خود کو مکمل طور پر فنا کرنا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے "بقا" پر بھی زور دیا، یعنی اس فنا کے بعد انسان کو دوبارہ دنیا میں ایک نیا روحانی شعور حاصل ہوتا ہے، جس سے وہ مخلوق کے درمیان رہتے ہوئے بھی خدا کی قربت میں رہتا ہے۔ [16]

شریعت اور طریقت کا امتزاج : حضرت جنید نے صوفیانہ طریقت کو شریعت کے ساتھ مکمل ہم آہنگ سمجھا۔ ان کے نزدیک صوفیانہ زندگی کے باطنی اور ظاہری دونوں پہلوؤں کا توازن ضروری تھا۔ وہ تصوف کو اسلامی شریعت کا باطنی رخ سمجھتے تھے اور ان کی تعلیمات میں شرعی قوانین کی مکمل پابندی پر زور دیا گیا ہے۔

---

14 مفتی محمد صدیق ھزاروی، رسالہ قشیریہ "ناشر مکتبہ اعلی دربار مارکیٹ لاہور 2009ء، ص 174

15 طبقات الصوفیہ "پبلشر دار الجیل، 1990، ص 146۔" : ابو عبدالرحمن السلمی،

16 مفتی محمد صدیق ھزاروی، رسالہ قشیریہ "ناشر مکتبہ اعلی دربار مارکیٹ لاہور 2009ء، ص 166

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

خاموشی اور تصوف : جنید بغدادی کے نزدیک "صمت" یعنی خاموشی ایک اہم روحانی عمل تھا۔ان کے نزدیک صوفی کو زیادہ بولنے کے بجائے خاموشی اختیار کر کے اندرونی مراقبے میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ دل کو خدا کی طرف مائل کیا جا سکے۔

حضرت فراغانی فرماتے ہیں: حضرت جنید بغدادی) سے پوچھا گیا کہ عارف کون ہے ؟ "

فرمایا:(مَنْ نَطَقَ عَنْ سِرِّكَ وَأَنْتَ سَاكِتٌ)جو تیرے اندر کی بات کرے اور تو خاموش رہے۔" حضرت ابو محمد جریری ہی فرماتے ہیں حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں:"ہم نے تصوف بحث مباحثہ سے حاصل نہیں کیا بلکہ بھوک، ترک دنیا اور محبوب اور عمدہ چیزوں سے قطع تعلق کے باعث حاصل کیا۔ حضرت ابو علی روز باری یہ فرماتے ہیں: ایک شخص نے حضرت جنید بغدادی کے سامنے اہل معرفت کا ذکر کیا اور کہا کہ اہل معرفت ترقی کرتے کرتے اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ وہ نیکی اور اللہ کے تقریب کے لیے حرکت بند کر دیتے ہیں۔

تو حضرت جنید بغدادی نے فرمایا: یہ قول، اعمال کو چھوڑنے کا قول ہے اور میرے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جو شخص چوری اور زنا کا مرتکب ہوتا ہے وہ اس قول والے سے اچھی حالت میں ہے۔ بے شک اللہ کی معرفت رکھنے والوں نے رسول اللہ ﷺ سے اعمال حاصل کیے اور وہ ان اعمال میں اس کی طرف لوٹے اور اگر میں ایک ہزار سال زندہ رہوں تو میں نیک اعمال میں سے ایک ذرہ بھی کم نہ کروں البتہ یہ کہ ان اعمال تک پہنچنے میں مجھے کوئی رکاوٹ ہو جائے۔ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا: "اگر تمھارے لیے ممکن ہو کہ تمھارے سامنے صرف ٹھیکری کی صورت میں سامان ہو تو ایسا کرو (یعنی سادگی اختیار کرو اور زہد کو اپناؤ)۔

حضرت جنید بغدادی نے فرمایا: "لوگوں پر رسول اکرم ﷺ کی اتباع کے علاوہ تمام راستے بند ہیں۔" حضرت ابو عمر انماطی یہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت جنید بغدادی ہی کو فرماتے ہوئے سنا: اگر کوئی سچا آدمی دس لاکھ سال بھی اللہ کی طرف متوجہ ہو پھر اس سے ایک لمحہ کے لیے بھی منہ پھیرے تو اس نے جو کچھ پایا اس سے زیادہ اس نے ضائع کر دیا۔[17]

حضرت جنید بغدادی ہے فرماتے ہیں:"جو شخص قرآن مجید حفظ نہ کرے اور نہ حدیث لکھے اس (تصوف کے) معاملے میں اس کی اقتداء نہ کی جائے کیونکہ ہمارا یہ علم کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے۔"

حضرت ابو علی روز باری یہ حضرت جنید بغدادی سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

"ہمارا یہ مذہب کتاب و سنت کے اصول سے مقید ہے۔[18]"

حضرت ابو الحسین علی بن ابراہیم حداد ملیے فرماتے ہیں: میں حضرت قاضی ابو العباس بن شریح کی مجلس میں حاضر ہوا انھوں نے اصول اور فروع کے بارے میں بہت عمدہ کلام کیا جس پر میں حیران ہوا۔ جب انھوں نے میری حیرانگی دیکھی تو پوچھا کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں نے یہ کہاں سے حاصل کیا ہے؟ میں نے کہا یہ تو قاضی (ابو العباس بن شریح یہ فرما رہے ہیں (یعنی آپ فرما رہے ہیں)۔ انھوں نے فرمایا: یہ حضرت ابو القاسم جنید بغدادی ہی کی ہم نشینی کی برکت ہے۔ حضرت جنید بغدادی ہی سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا؟ انھوں نے فرمایا: میں تمیں سال (30) تک اس سیڑھی کے نیچے اللہ ان کے سامنے بیٹھا۔ انھوں نے اپنے گھر میں ایک سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت استاذ ابو علی دقاق ہے فرماتے ہیں: ان (حضرت جنید بغدادی) کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی گئی تو کہا گیا۔ آپ نے اس قدر عزت کے باوجود اپنے ہاتھ میں تسبیح پکڑی ہوئی ہے؟ انھوں نے فرمایا: یہ ایک راستہ ہے جس کے ذریعے میں اپنے رب تک پہنچا ہوں میں اسے جدا نہیں کروں گا۔

حضرت استاذ ابو علی دقاق یہ فرماتے ہیں: حضرت جنید بغدادی روزانہ اپنی دکان میں داخل ہوتے اور پردہ

لٹکا کر چار سو (400) رکعات پڑھتے پھر اپنے گھر کی طرف تشریف لاتے۔ حضرت ابو بکر عطوی ہے فرماتے ہیں: میں حضرت جنید بغدادی کے وصال کے وقت ان کے پاس تھا۔ انھوں نے پورا قرآن ختم کیا پھر سورۂ بقرہ سے ابتدا کی اور ستر (70) آیات پڑھنے کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔

حکیم سنائی

[17] ضیاء الحق فاروقی حضرت جنید بغدادیؒ۔ شخصیت اور تصوف، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 1993، ص 51

سنن ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب هل يرث المسلم الكافر؟ حدیث: 2011. اولیاء کرام پر اللہ کا فضل ہوتا ہے کہ ان کو حلال و حرام کی تمیز ہو جاتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ تقوی ہے ۔۱۲ ہزاروی

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

نظریات: سنائی کی شاعری میں عشق الٰہی اور باطنی تجربات کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف، جیسے "حدیقۃ الحقیقت"، میں خدا کے ساتھ تعلق کی گہرائی پر زور دیا گیا ہے۔[19]

غزالی

نظریات: امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" میں روحانی خودی کی تلاش اور عشق الٰہی کی جستجو پر زور دیا گیا ہے۔ وہ انسانی تجربات کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔[20]

شمس تبریزی

شمس تبریز (1185–1248) ایک عظیم صوفی اور روحانی استاد تھے جنہیں مولانا جلال الدین رومی کے مرشد کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کا مکمل نام شمس الدین محمد تبریزی تھا اور وہ ایران کے شہر تبریز میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی اور تعلیمات تصوف میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ وہ رسمی مذہبی اصولوں اور ظاہر پرستی سے ہٹ کر ایک گہری روحانی تجربے کی وکالت کرتے تھے۔

شمس تبریز کی تصوفی تعلیمات کا جائزہ

باطنی علم کا زور

شمس تبریز کا تصوف کا بنیادی اصول یہ تھا کہ باطنی علم (علمِ لدنی) ظاہری علم سے زیادہ اہم ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان کو صرف کتابوں کے علم پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ روحانی تجربہ، محبت، اور معرفت الٰہی کے ذریعے خدا کی قربت حاصل کرنی چاہیے۔ وہ رسمی عبادات اور ظاہری ریاضات کو مکمل مقصد کے طور پر نہیں دیکھتے تھے، بلکہ انہیں ایک ذریعہ سمجھتے تھے جس کے ذریعے انسان اپنے اندرونی نفس کی حقیقت کو جان سکتا ہے۔

محبت کا فلسفہ

شمس تبریز کی تعلیمات میں محبت ایک مرکزی مقام رکھتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ محبت کے ذریعے ہے، اور یہ محبت خدا، اس کی مخلوقات اور انسانیت سے بے پناہ وابستگی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس محبت کی حالت میں انسان اپنے نفس کی نفی کرتا ہے اور فنافی اللہ کے مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

رومی اور شمس کی ملاقات

شمس تبریز اور مولانا رومی کی ملاقات تصوف کی تاریخ میں ایک اہم ترین واقعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس ملاقات نے رومی کی زندگی کو مکمل طور پر بدل دیا۔ شمس تبریز نے رومی کے اندر موجود روحانی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور انہیں عشق حقیقی کے راستے پر ڈالا۔ رومی کی شاعری، خاص طور پر "مثنوی معنوی" اور "دیوان شمس تبریز"، شمس کے ساتھ ان کے گہرے روحانی تعلقات کا مظہر ہے۔[21]

ظاہری اصولوں سے انکار

شمس تبریز روایتی مذہبی اصولوں اور رسومات کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہبی رسومات اکثر لوگوں کو اصل مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اور وہ صرف ظاہری عبادات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، جبکہ روحانی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کا قرب صرف عبادات سے نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی اور نیت کی خالصیت سے حاصل ہوتا ہے۔

فنا اور بقا

شمس تبریز فنافی اللہ اور بقاباللہ کی تعلیم دیتے تھے، یعنی انسان کو اپنے نفس کی خواہشات اور خودی کو فنا کرنا ہوگا تاکہ وہ خدا کی محبت میں غرق ہو سکے۔ جب انسان اپنی خودی سے نکل جاتا ہے تو وہ ایک نئی روحانی زندگی حاصل کرتا ہے جسے بقاباللہ کہتے ہیں۔

معرفت کا فلسفہ

شمس تبریز کا ایک اہم فلسفہ معرفت کا ہے۔ معرفت کے ذریعے انسان خدا کی ذات کو پہچانتا ہے

---

[19] سنائی، حدیقۃ الحقیقت، مطبع مصطفائی، لاہور، 1988، ص 71

[20] غزالی، احیاء علوم الدین، دار المنہاج، جدہ، 2011، ص 98

[21] جلال الدین محمد بلخی "دیوان شمس تبریز، ناشر : انتشارات آستان مہر ص 106

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

اور اپنے اندر کی حقیقت کو جانتا ہے۔ یہ ایک داخلی راستہ ہے جو مراقبہ، دعا اور اللہ کی محبت کے ذریعے انسان کو خود آگاہی اور خدا شناسی کی طرف لے جاتا ہے۔

شمس کی عدم موجودگی کا راز

شمس تبریز کی شخصیت اور ان کی اچانک گمشدگی ایک راز بن کر رہ گئی ہے۔ بعض روایات کے مطابق وہ اپنے مخالفین کے ہاتھوں مارے گئے، جبکہ کچھ دیگر ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ خود کو گمنامی میں لے گئے تاکہ روحانی سفر کو مزید گہرائی میں لے جا سکیں۔[22]

نظریات

: شمس کی تعلیمات میں عشق کی جستجو اور خودی کی شناخت پر زور دیا گیا ہے۔ ان کا پیغام عشقِ الٰہی کی ہمہ گیری اور باطنی تجربات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ .

آر۔ایم۔ اسٹرونگ کے وجودیت پر نظریہ:

آر۔ایم۔ اسٹرونگ کے نزدیک انسان کی حقیقت ایک مستقل سوال ہے۔ اسٹرونگ نے وجودیت کو ایک موضوع بنایا اور انسانی شعور اور تجربات پر اپنی توجہ مرکوز کی۔[23]

صوفیاء کا انسان کے وجود سے متعلق نظریہ:

صوفیاء کے نزدیک انسان کا حقیقی مقصد خدا کی معرفت حاصل کرنا اور اپنی باطنی حقیقت کو سمجھنا ہے۔

شعور اور صوفیانہ مراقبہ:3

آر۔ایم۔ اسٹرونگ کے نظریات میں شعور کی کئی پرتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی حقیقت جاننے کے لیے اپنے شعور کی گہرائیوں میں اترنا چاہیے، جو کہ صوفیانہ مراقبے کی تعلیمات کے قریب ہے۔

"حقیقت کی تلاش: فلسفہ اور صوفیانہ تعلیمات

آر۔ایم۔ اسٹرونگ کے فلسفہ میں حقیقت کی تلاش اور اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ ملتا ہے، جو کہ صوفیاء کے "حق" ultimate کے تصور سے مشابہ ہے۔[24]

"خدا کا تصور:

آر۔ایم۔ اسٹرونگ کے ہاں خدا کا تصور فلسفیانہ حد تک محدود ہے جبکہ صوفیاء کے نزدیک خدا ہر شے کا حقیقی مصدر ہے۔[25]

شیخ جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مجھے کسی نے یوسف بن حسین رازی رحمہ اللہ کی نسبت بتایا کہ انہوں نے کہا: ایک شخص ذوالنون مصری رحمہ اللہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا: بتاؤ توحید کیا ہے؟ ذوالنون نے جواب دیا: توحید یہ ہے کہ تو یہ جان لے کہ اللہ کی قدرت اشیاء میں جاری ہے مگر اس طرح نہیں کہ دونوں باہم مل گئی ہوں اور اشیاء کو بغیر زور لگائے کر گزرنا ہے۔ ہر چیز کی علت اس کی کاریگری ہے مگر اللہ کی کاریگری کی کوئی علت نہیں اور بلند آسمانوں اور پست زمینوں کے اندر اللہ کے سوا کوئی تدبیر کنندہ نہیں اور تمہارے ذہن کے اندر اللہ کا جو تصور بھی آئے وہ اللہ نہیں بلکہ وہ کچھ اور ہی ہے۔

جنید سے توحید کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: اللہ تعالی کی وحدانیت کو حق جانتے ہوئے اس کی احدیث کے کمال کے ساتھ اسے واحد جاننا توحید ہے۔ یعنی وہ ایسا یکتا ہے کہ نہ کسی کو اس نے جنا اور نہ کسی نے اسے جنا، اس کی کوئی ضد نہیں کوئی مثل نہیں کوئی مشابہ نہیں۔ اور اللہ کے سوا جن کی پرستش کی جاتی ہے انہیں خدا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب صفات جن کا ذکر ہم نے اللہ کیلئے کیا ہے تمام کی تمام بلا تشبیہ، بلا تصویر اور بلا تمثیل ہیں (ص) وہ ایک خدا ہے۔ بے نیاز ہے۔ یکتا ہے اس کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

---

[22] عطار، فرید الدین، تذکرۃ الاولیاء، شمس تبریز کی زندگی اور تعلیمات کا ذکر، دار الاشاعت کراچی 1910 ص 142

[23] Strong, R.M., **Existentialism and the Modern Mind**, نیویارک: رینڈم ہاؤس، 1968

[24] The Nature of Consciousness," R.M. Strong (1972) ,p 45

[25] God and the Limits of Human Understanding," R.M. Strong (1980 , p 32".

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

ایک بار اور جنید رحمہ اللہ سے توحید کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: یہاں آکر تمام ظاہری علامات مٹ جاتی ہیں اور تمام علوم یہاں آکر جمع ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی اللہ تعالی وہی کا وہی ہوتا ہے جو ازل میں تھا ۔

محبت اور روحانی تجربہ

یہ مضامین کہ دنیا چار دن کی چاندنی ہے، اس کے لئے جھگڑوں اور بھیڑوں میں پڑنے سے کیا حاصل، کھاؤ پیو اور لطف اٹھاؤ اور دنیا سے گزر جاؤ، سو طرح بندھ چکے ہیں، اور خیام کی تمام شاعری کی یہی کائنات ہے لیکن خواجہ صاحب کے ہاں جو جوش بیان پایا جاتا ہے فارسی شاعری اس سے خالی ہے۔

یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قادر چھا گیا تھا کہ بوریا سے فقران کو مسند جمشید نظر آتا تھا وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اٹھائیں وہ مناظر قدرت سے بہار سے آپ سے سبزہ وزار سے لطف اُٹھاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے، اس بنیا پر وہ تمام دنیا کو خوش نصیبی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، وہ فلسفی تھا، اس لئے جو کچھ کہتا تھا فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا، خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے اس لئے انھوں نے خوش عیشی کی انہیں تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوش مسرت سے لبریز نظر آتا ہے۔[26]

صوفیاء کرام کی تعلیمات میں محبت ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے، جبکہ آر۔ ایم۔ اسٹرونگ بھی انسانی تجربات میں محبت کو اہمیت دیتے ہیں۔

شمس تبریز: (1248–1185)

ایک عظیم صوفی اور روحانی استاد تھے جنہیں مولانا جلال الدین رومی کے مرشد کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کا مکمل نام شمس الدین محمد تبریزی تھا اور وہ ایران کے شہر تبریز میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی اور تعلیمات تصوف میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ وہ رسمی مذہبی اصولوں اور ظاہر پرستی سے ہٹ کر ایک گہری روحانی تجربے کی وکالت کرتے تھے۔

کیرن آرمسٹرانگ کی تشریح: فنا کا فلسفہ

آرمسٹرانگ کے مطابق فنا کا فلسفہ دراصل روحانی خودشناسی کا ایک عمل ہے۔ وہ اسے اس طرح دیکھتی ہیں کہ یہ انسان کو اس کی ظاہری خودی سے بلند کر کے ایک زیادہ جامع اور روحانی حقیقت میں داخل کرتا ہے۔ فنا کا عمل صرف خودی کی نفی نہیں ہے، بلکہ یہ دنیاوی تعلقات اور محدودیت سے آزادی کا سفر ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ فنا انسان کے اندر موجود انانیت اور مادی دنیا کے ساتھ جڑے ہر قسم کے تعلق کو ختم کرتا ہے، تاکہ صوفی اپنے آپ کو خدائی حقیقت کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کر سکے۔

آرمسٹرانگ کی کتاب "Islam: A Short History" میں، وہ صوفی ازم کی اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ فنا دراصل انسان کو اس کی ذات کے مقابلے میں ایک وسیع تر حقیقت کی طرف لے جاتی ہے، جہاں انسان کو اپنی عاجزی کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اپنی انفرادی حیثیت کو فنا کر دیتا ہے۔ اس مرحلے پر انسان کو خدا کی ذات کے علاوہ کوئی حقیقت دکھائی نہیں دیتی، اور یہی "توحید" کی حقیقت ہے، جسے صوفیا بیان کرتے ہیں۔[27]

بقا: خدا کے ساتھ وابستگی کا فلسفہ

بقا، فنا کے بعد کا مرحلہ ہے اور کیرن آرمسٹرانگ کے نزدیک یہ ایک نیا روحانی وجود حاصل کرنے کا عمل ہے۔ جب صوفی فنا کے مرحلے میں اپنے نفس کو مٹا دیتا ہے، تو وہ بقا کے مرحلے میں خدا کے ساتھ ایک دائمی اور مستحکم تعلق قائم کرتا ہے۔ آرمسٹرانگ کے مطابق، یہ وہ مرحلہ ہے جہاں صوفی خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اور خدا کی رضا کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا نفس تو مٹ چکا ہوتا ہے، لیکن اس کی روح خدا کی صفات میں زندہ ہو جاتی ہے۔

آرمسٹرانگ کی کتاب "The Great Transformation" میں، وہ اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ بقا کا فلسفہ صرف تصوف تک محدود نہیں ہے، بلکہ مختلف مذاہب میں بھی انسان کے روحانی سفر کی ایک بڑی منزل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ بقا کو اس معنوں میں بیان کرتی ہیں کہ یہ انسان کے لئے ایک نئی قسم کی موجودگی ہے، جس میں اس کی ہر حرکت اور سوچ خدا کی رضا کے تابع ہوتی ہے۔ اس نئے وجود میں، صوفی خدا کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اور اس کی زندگی کا ہر عمل خدا کی عظمت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

فنا اور بقا: دیگر تصوفی مفکرین کے ساتھ تقابل

---

[26] حافظ شیرازی، دیوانِ حافظ، الفیصل ناشران، لاہور، 2010، ص 21

Armstrong, Karen. Islam: A Short History. Modern Library Chronicles, 2002 , p 82[27]

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

کیرن آر مسٹرانگ نے اپنی تصانیف میں مختلف تصوفی مفکرین کے ساتھ فنااور بقاکے تصورات کا تقابلی جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ امام غزالی، ابن عربی، اور مولانا رومی کے خیالات کو بھی اپنے تجزیے میں شامل کرتی ہیں۔ ان کے مطابق، غزالی فنا کو خودی کی نفی اور خدا کی طرف واپسی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، جبکہ ابن عربی فنا کو وحدت الوجود کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ قرار دیتے ہیں۔

مولانا رومی کی شاعری اور شمس تبریز کے ساتھ ان کے روحانی تجربے پر بات کرتے ہوئے، آر مسٹرانگ نے فنا کو عشق حقیقی کا ایک نتیجہ بتایا ہے، جس میں عاشق اپنے محبوب کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے اور بقا کے مرحلے میں دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔[28]

فنااور بقاکا روحانی اور نفسیاتی پہلو

آر مسٹرانگ فنااور بقا کو ایک نفسیاتی اور روحانی سفر کے طور پر بھی بیان کرتی ہیں، جس میں فرد اپنے انا (ego) سے آزادی حاصل کرتا ہے۔ ان کے مطابق، فنا دراصل انسانی انا کی نفی کا عمل ہے، جو انسان کو اپنی اصل حقیقت، یعنی روحانی فطرت کی جانب لے جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی موت اور دوبارہ پیدائش کا عمل ہے، جس کے ذریعے صوفی اپنے اندرونی وجود کی ایک نئی حقیقت کو پاتا ہے۔[29]

ابوسعید خزاز

ابوسعید خزاز (ابوسعید فضل بن محمد بن عبدالواحد خزاز) اسلامی تصوف کے ایک اہم اور ابتدائی صوفی ہیں جن کا تعلق نویں صدی عیسوی سے ہے۔ ان کا تعلق بغداد سے تھا، جو اس وقت صوفیانہ علوم کا مرکز تھا۔ ان کی شخصیت اور تعلیمات کو اسلامی تصوف میں ایک اہم مقام حاصل ہے، اور وہ اپنے نظریات، تعلیمات اور روحانی تجربات کے ذریعے بعد کے صوفی علماء اور سالکین پر گہرے اثرات ڈال چکے ہیں۔

ابوسعید خزاز کا تصوف

فقر (غربت) کا تصور: ابوسعید خزاز کے تصوف میں فقر کا مرکزی مقام ہے۔ ان کے نزدیک فقر صرف مادی غربت نہیں ہے، بلکہ دل سے ہر شے کی بے نیازی اور اللہ کے سوا کسی چیز کی خواہش نہ رکھنا ہے۔ یہ حالت ایک صوفی کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ خود کو اللہ کے قریب کر سکے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خزاز فرماتے تھے، "صوفی وہ ہے جس کے دل میں سوائے اللہ کے کچھ نہ ہو۔"[30]

تصورِ توکل

ابوسعید خزاز توکل کے بڑے قائل تھے۔ ان کے نزدیک اللہ پر مکمل بھروسہ رکھنا اور اپنی تمام خواہشات اور معاملات کو اللہ کے حوالے کر دینا ایک مومن کے لیے ضروری ہے۔ اس حوالے سے وہ فرماتے ہیں کہ توکل کی اعلیٰ حالت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے اور دنیاوی خواہشات سے دستبردار ہو جائے۔ قرب اور محبتِ الٰہی: خزاز کے نزدیک محبتِ الٰہی اور اللہ کا قرب پانے کے لیے انسان کو اپنی خودی اور نفسانی خواہشات کو فنا کرنا ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ کی محبت میں فنا ہونا ہی اصل کامیابی ہے۔ اللہ کی محبت میں فنا ہونے کو "فنافی اللہ" کہا جاتا ہے، جس کے بعد "بقا باللہ" کا مرحلہ آتا ہے، یعنی جب سالک اللہ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔[31]

معرفت اور حقیقت کا تصور

ابوسعید خزاز کے تصوف میں معرفت (gnosis) ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک معرفت اللہ کی ذات کی پہچان اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کا نام ہے۔ اس کے لیے سالک کو اپنے نفس کو پاک کرنا پڑتا ہے اور دنیاوی علائق سے نجات حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب سالک کو اللہ کی حقیقت اور اس کی صفات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

---

[28] Armstrong, Karen. A History of God: The 4,000-Year Quest of Judaism, Christianity and Islam. Ballantine Books, 1993 p 98.

[29] Armstrong, Karen. The Spiral Staircase: My Climb Out of Darkness

[30] شیخ عبدالقادر جیلانی، سرالاسرار" دارالاشاعت، لاہور، ص92

[31] ایضا

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

ریاضت اور زہد: ابو سعید خزاز کے تصوف میں ریاضت اور زہد کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے نزدیک روحانی کمال حاصل کرنے کے لیے سالک کو دنیاوی لذات اور خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے۔ اس عمل کے ذریعے ہی وہ اللہ کی قربت اور معرفت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ ابو سعید خزاز کے تصوف میں فقر، توکل، محبتِ الٰہی، معرفت، اور ریاضت جیسے موضوعات کو سمجھنے کے لیے ان کی تعلیمات کا مطالعہ بہت اہم ہے۔

اہم اقوال

ابو سعید خزاز کی کتاب کتاب الحقائق تصوف کے بنیادی اصولوں اور صوفیانہ تجربات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب صوفیوں کے باطنی تجربات اور اللہ کے ساتھ قربت کی تفصیلات بیان کرتی ہے۔ اگرچہ کتاب کے مکمل متن تک رسائی محدود ہے، لیکن اس میں موجود کچھ مشہور اور اہم صوفیانہ اقوال درج ذیل ہیں جو صوفیاء کے حلقوں میں مشہور ہیں:

حقائق اور حقیقت کا تصور

"اللہ کے حقائق کو سمجھنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو اپنی دنیاوی خواہشات سے نجات پا چکے ہیں۔ حقائق وہ سچائیاں ہیں جو صرف دل کی پاکیزگی اور اللہ کی قربت کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔"

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ خزاز کے نزدیک حقیقت کی معرفت اللہ کے قرب سے جڑی ہوئی ہے اور اسے دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔[32]

فقر اور بے نیازی

"فقر وہ نہیں ہے کہ تمہارے پاس کچھ نہ ہو، بلکہ فقر یہ ہے کہ تم دل سے دنیا کے تمام علائق سے آزاد ہو جاؤ اور اللہ کے سوا کسی اور پر انحصار نہ کرو۔" یہاں فقر کو مادی غربت کے بجائے دل کی کیفیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جہاں انسان کی پوری توجہ اللہ کی ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

توکل کا مقام

"جب تم اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دو اور تمہاری تمام خواہشات اللہ کی رضا میں فنا ہو جائیں، تب تم نے حقیقی توکل کو پا لیا۔"

یہ قول توکل کے تصور کو وضاحت سے بیان کرتا ہے، جہاں سالک اللہ پر مکمل بھروسہ کرتا ہے اور اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر اللہ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔

معرفتِ الٰہی

"اللہ کی معرفت دل کی آنکھ سے دیکھی جاتی ہے، نہ کہ عقل و خرد کی آنکھ سے۔ جو دل اللہ کی محبت سے روشن ہو، وہی اللہ کی حقیقت کو پہچانتا ہے۔" اس قول میں معرفت کو ایک روحانی تجربہ کہا گیا ہے جو عقل کے بجائے دل کی پاکیزگی اور محبت سے حاصل ہوتی ہے۔

محبت اور فنا فی اللہ

"جب تمہارا دل اللہ کی محبت میں فنا ہو جائے اور تمہاری خودی کا وجود باقی نہ رہے، تو تم نے محبت کا اصل مقام پا لیا۔"

اس قول سے ابو سعید خزاز کی تعلیمات میں محبتِ الٰہی کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ محبت کو فنا کا ذریعہ سمجھتے تھے جہاں سالک اپنی ذات کی نفی کر کے اللہ کی محبت میں فنا ہو جاتا ہے۔[33]

صبر اور رضا

"صبر وہ حالت ہے جہاں تم اللہ کی ہر حالت کو قبول کرو، چاہے وہ تمہارے نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اور رضا یہ ہے کہ تمہارے دل میں کوئی شکوہ یا گلہ نہ ہو، بلکہ تم اللہ کی ہر تقدیر پر خوش رہو۔"

---

[32] کتاب الحقائق، شیخ عبد الکریم الجیلی، ناشر زوار اکیڈمی اور دار الاشاعت، 2004، ص 91

[33] علی بن عثمان الہجویری "کشف المحجوب" اشاعت: 1911، ناشر: پنجاب یونیورسٹی، ص 151،

یہاں خزاز نے صبر اور رضا کو اللہ کی تقدیر کے قبول کرنے اور اس پر راضی ہونے کی اعلیٰ حالت کے طور پر بیان کیا ہے۔

ریاضت اور زہد

"جو شخص دنیا کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور اپنے نفس کی خواہشات کو ختم کرتا ہے، وہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔"

اس قول میں ریاضت اور زہد کو اللہ کی قربت کا ذریعہ بتایا گیا ہے، جہاں انسان دنیاوی خواہشات کو ترک کر کے اللہ کی راہ میں خود کو پیش کرتا ہے۔[34]

آرام سٹرانگ اور صوفیاء کی تعلیمات کا ہم آہنگی

روحانی تجربہ

سٹرانگ کی طرح، صوفیاء بھی روحانی تجربے کو بہت اہمیت دیتے ہیں، جو کہ انسان کو اپنی حقیقت کے قریب تر کرتا ہے

باطنی علم

سٹرانگ اور صوفیاء دونوں کا ماننا ہے کہ باطنی علم ہی حقیقی علم ہے، جو کہ ظاہری علم سے بالاتر ہے۔

انسانی حالت

دونوں نظریات میں انسانی حالت کی کمزوری اور اس کے بڑھنے کی بات کی گئی ہے۔

سموری عالم کی ایک وجہ

سٹرانگ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہر چیز کی ایک وجہ ہوتی ہے، جو کہ صوفیاء کے نظریات سے مطابقت رکھتا ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہر چیز کی ایک وجہ ہوتی ہے، جو صوفیاء کے نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ صوفیاء کے نزدیک کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی مقصد کے تحت تخلیق کی گئی ہے، اور اس کے پیچھے ایک پوشیدہ حکمت موجود ہے۔ ان کے نزدیک انسان اور دنیا کی مادی حقیقت کے پیچھے روحانی اصول کارفرما ہیں، اور خدا کی قدرت اس کائنات کی تمام حرکتوں کا سرچشمہ ہے۔ آرمسٹرانگ کے مطابق، یہ فلسفہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ انسانی تجربات اور مشاہدات کو ایک وسیع تر معنوی اور روحانی نظام کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔

خود کو بھولنا

سٹرانگ اور صوفیاء دونوں خود کو بھولنے کی تعلیم دیتے ہیں، تاکہ انسان اپنے حقیقی مقصد کی طرف جا سکے۔

نیک عمل

سٹرانگ کے نظریات میں نیک اعمال کی اہمیت کو بھی مانا گیا ہے، جو کہ صوفیاء کی تعلیمات میں بھی پائی جاتی ہے۔

آرمسٹرانگ یہ بتاتی ہیں کہ مذاہب نے ہمیشہ انسانوں کی زندگی میں ایک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ ہر مذہب نے اپنے ماننے والوں کو دنیا کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر فراہم کیا اور انہیں زندگی کے مختلف مراحل میں رہنمائی دی۔ مذہبی روایات میں عقائد، رسومات، اور عبادات شامل تھیں جو انسانوں کو ایک روحانی ڈھانچہ فراہم کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر، اسلام میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسی عبادات انسان کو خدا سے جوڑنے اور ایک متوازن زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی دعا، عبادت اور اخلاقی اصولوں کی پیروی ایک نیک اور بامقصد زندگی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔[35]

تخلیق کا تصور

آرم سٹرانگ نے تخلیق کے تصور کو صوفیاء کے نظریات کے ساتھ جوڑا ہے، کہ یہ سب ایک ہی حقیقت کا حصہ ہیں۔

مراقبہ:

سٹرانگ کے مطابق مراقبہ کے ذریعے روحانی تجربات کی گہرائی میں جایا جا سکتا ہے، جو کہ صوفیاء کا بھی عمل ہے۔

---

[34] رسالہ قشیریہ از **امام قشیری**) اشاعت: 1934، ناشر: دار الکتب العلمیہ، صفحہ 82

[35] Strong, R.M., Existentialism and the Modern Mind, نیویارک: رینڈم ہاؤس، 1968، ص35

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.03 (2025)

دل کی purity

دونوں نظریات دل کی پاکیزگی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، تاکہ انسان اللہ کی قربت حاصل کر سکے

صوفیانہ فنون

سٹرانگ نے صوفیانہ فنون کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے، جو کہ روحانی تلاش میں مددگار ہوتے ہیں۔

سب کا ایک ہونا

ایک اہم پیغام جو دونوں نظریات میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اور یہی روحانی سچائی ہے۔ آرم سٹرانگ اور صوفیاء کے نظریات میں گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دونوں ہی روحانی تجربات کو اہمیت دیتے ہیں اور روحانی حقیقت کی تلاش میں انسان کو رہنما فراہم کرتے ہیں۔

خلاصہ بحث

کیرن آرمسٹرانگ اور صوفیاء کے نظریات کا تقابلی جائزہ ان کے درمیان گہری ہم آہنگی کو ظاہر کرتا ہے، جو خدا کی محبت، انسانی شفقت، اور روحانی تجربے پر مبنی ہے۔ دونوں مذہب کو ایک ذاتی اور قلبی سفر کے طور پر دیکھتے ہیں جو عقل سے ماورا ہے۔ آرمسٹرانگ کی تعلیمات اور صوفیانہ فلسفہ دونوں عاجزی، خودی کی نفی، اور تمام مذاہب کی مشترکہ حقیقت پر زور دیتے ہیں۔ وہ بنیاد پرستی کی نفی کرتے ہوئے رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ مشترکات نہ صرف انفرادی روحانی ترقی کے لیے اہم ہیں بلکہ ایک ایسی دنیا کی تشکیل میں بھی کردار ادا کر سکتے ہیں جہاں محبت اور ہمدردی بنیادی اصول ہوں۔ اس مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روحانی تجربات اور انسانی اقدار کے ذریعے انسانیت کو متحد کرنے کی صلاحیت موجود ہے، جو آج کے عالمی تناظر میں انتہائی اہم ہے۔